© rasailojaraid.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

پچھلے ماہ مئی، جون اور جولائی کی اشاعتوں میں مسلم معاشرے کی اصلاح اور اسلامی نظامِ زندگی کی تعمیر کے متعلق اِن صفحات میں جو سلسلۂ کلام چل رہا تھا، افسوس ہے کہ پے در پے سفر اور مسلسل مصروفیتوں کے باعث وہ جاری نہ رہ سکا۔ اب پھر کچھ فرصت بہم پہونچی ہے اور خیال ہے کہ دو تین اشاعتوں میں اسے مکمل کر دیا جائے۔

جو کچھ اب تک کہا جا چکا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اصلاح و تعمیر کے لیے ایک صحیح لائحۂ عمل جتنا ضروری ہے، اس سے بہت زیادہ ضروری ایسے کارکنوں کا وجود ہے جو اس کام کے لیے موزوں اخلاقی اوصاف رکھتے ہوں، کیونکہ آخرکار جس چیز کو معاشرے کے بگاڑ سے نبرد آزما اور تعمیرِ صالح کی آزمائشوں سے دوچار ہونا ہے وہ کسی لائحۂ عمل کی دفعات نہیں بلکہ اُن لوگوں کی انفرادی و اجتماعی سیرت ہے جو میدانِ عمل میں کام کرنے کے لیے آگے بڑھیں، اس لیے ہمیں آئندہ کے تعمیری و اصلاحی پروگرام کی تفصیلات پر گفتگو کرنے سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ اس کام کے لیے کیسے کارکن درکار ہیں، ان کو کن اوصاف سے متصف اور کن برائیوں سے پاک ہونا چاہیے، اور ایسے کارکنوں کی تیاری کے ذرائع کیا ہیں۔ اس حقیقت کو واضح کرنے کے بعد ہم نے اوصافِ مطلوبہ کو تین حصوں میں بیان کیا ہے :-

اولاً، وہ اوصاف جو بنیادی طور پر اِس حیثیت سے اس کام میں حصہ لینے والے ہر فرد کے اندر موجود ہونے چاہییں اور وہ یہ ہیں: (۱) دین کا صحیح فہم (۲) اس پر پختہ ایمان (۳) اس کے مطابق سیرت و کردار (۴) اس کی اقامت کو مقصدِ زندگی بنانا۔

ثانیاً، وہ اوصاف جو اس خدمت کے لیے اٹھنے والی جماعت میں پائے جانے چاہییں، اور وہ یہ ہیں: (۱) باہمی محبت، حسنِ ظن، اخلاص، ہمدردی و خیر خواہی اور ایک دوسرے کے لیے ایثار۔ (۲) آپس کے مشورے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے کام کرنا اور مشاورت کے اسلامی آداب کو ملحوظ رکھنا۔ (۳) نظم و ضبط، باضابطگی و باقاعدگی، تعاون اور ٹیم اسپرٹ (۴) تنقید بغرضِ اصلاح، جو سلیقے اور معقول طریقے سے ہو، جس سے جماعت کے اندر رونما ہونے والی خامیوں کا بروقت تدارک ہو سکے نہ کہ خرابیوں میں الٹا اضافہ ہو۔

ثالثاً، وہ اوصاف جو سعیِ اصلاح کو صحیح خطوط پر چلانے اور حقیقی کامیابی کی منزل تک پہونچانے کے لیے ناگزیر ہیں، یعنی (۱) اللہ کے ساتھ گہرا تعلق اور اسی کی رضا کے لیے کام کرنا۔ (۲) آخرت کی بازپرس کو یاد رکھنا اور اجرِ آخرت کے سوا کسی دوسری چیز پر نگاہ نہ رکھنا۔ (۳) حسنِ اخلاق۔ (۴) صبر۔ (۵) حکمت۔

اب ہمیں یہ دکھانا ہے کہ وہ بڑی بڑی برائیاں کیا ہیں جن سے اس مقصدِ عظیم کے خادموں کو پاک ہونا چاہیے۔

اولین اور بدترین عیب، جو ہر بھلائی کی جڑ کاٹ دیتا ہے، کبر و فخر، غرور، خود پسندی اور تعلّی ہے۔ یہ ایک سراسر شیطانی جذبہ ہے جو شیطانی کاموں کے لیے ہی موزوں ہو سکتا ہے، خیر کا کوئی کام اس کے ساتھ نہیں کیا جا سکتا اس لیے کہ بڑائی صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے، بندوں میں بڑائی کا گھمنڈ ایک جھوٹ کے سوا کچھ نہیں۔ جو شخص یا گروہ اس جھوٹے پندار میں مبتلا ہو وہ اللہ تعالیٰ کی ہر تائید سے محروم ہو جاتا ہے کیونکہ اللہ کو سب سے بڑھ کر یہی چیز اپنی مخلوق میں ناپسند ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس مرض کے مریض کو کبھی راہِ راست کی طرف ہدایت نہیں ملتی، وہ پے در پے جہالتوں اور حماقتوں کا ارتکاب کرتا ہے، یہاں تک کہ آخر کار ناکامی کا منہ دیکھتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ خلقِ خدا کے ساتھ برتاؤ میں اس سے تکبر کا جتنا جتنا اظہار ہوتا جاتا ہے اتنی ہی اس کے خلاف نفرت پیدا ہوتی چلی جاتی ہے حتیٰ کہ مبغوضِ خلائق ہو کر وہ اس قابل ہی نہیں رہتا کہ اس کا کوئی اخلاقی اثر لوگوں میں قائم ہو سکے۔

خیر کے لیے کام کرنے والوں میں یہ بیماری کئی راہوں سے آتی ہے۔ کم ظرف لوگوں میں یہ اس راہ سے آتی ہے کہ جب اُن کی دینی و اخلاقی حالت گرد و پیش کے معاشرے کی بہ نسبت کسی حد تک بہتر ہو جاتی ہے اور کچھ قابلِ قدر خدمات بھی وہ بجا لاتے ہیں جن کا اعتراف دوسروں کی زبانوں سے ہونے لگتا ہے، تو شیطان ان کے دلوں میں یہ وسوسہ ڈالنا شروع کر دیتا ہے کہ اب تم واقعی بڑی چیز ہو گئے ہو، اور شیطان ہی کی اکساہٹ سے وہ اپنی بڑائی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اپنی زبان اور اپنے طرزِ عمل سے جتانے پر اتر آتے ہیں۔ اس طرح وہ کام جس کا آغاز نیکی کے لیے نیکی کے جذبے سے ہوا تھا رفتہ رفتہ ایک نہایت غلط راہ پر چل پڑتا ہے۔ دوسرا راستہ اس کے آنے کا یہ ہے کہ جو لوگ نیک نیتی کے ساتھ ایک طرف اپنی اور دوسری طرف خلقِ خدا کی اصلاح کے لیے کوشش کرتے ہیں ان کے اندر لامحالہ کچھ بھلائیاں پیدا ہوتی ہیں، کسی نہ کسی حد تک وہ اپنے معاشرے کی عام حالت سے ممتاز ہوتے ہیں، کچھ نہ کچھ ان کی خدمات قابلِ قدر ثابت ہوتی ہیں۔ اور یہ ایسے واقعی امور ہیں جو بہرحال محسوس ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ یہ امرِ واقعی کا احساس بجائے خود فطری اور ناگزیر ہے، مگر نفس کی ایک ذراسی ڈھیل اور شیطان کی ایک ذرا سی اکساہٹ اسے تکبر اور خود پسندی میں تبدیل کر دیتی ہے۔ پھر بسا اوقات ایسی صورتیں بھی پیش آتی ہیں کہ جب ان کے مخالفین ان کے کام میں، اور کام سے گزر کر ان کی ذات میں کیڑے ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں، تو انھیں مجبوراً اپنی مدافعت میں ایسی باتیں کہنی پڑتی ہیں جو چاہے بیانِ واقعہ ہی ہوں مگر اپنے محاسن کے اظہار سے خالی نہیں ہوتیں۔ اس چیز کو ایک ذراسی بے اعتدالی جائز حد سے بڑھا کر تفاخر کے حدود میں پہونچا دیتی ہے۔

یہ ایک خطرناک چیز ہے جس سے ہر اُس شخص اور جماعت کو خبردار رہنا چاہیے جو خلوص کے ساتھ اصلاح کا مقصد لے کر اٹھے۔ ایسے ہر شخص میں فرداً فرداً اور ایسی ہر جماعت میں مجتمعاً عبدیت کا احساس نہ صرف موجود بلکہ زندہ اور تازہ رہنا چاہیے۔ اسے کبھی یہ حقیقت فراموش نہ کرنی چاہیے کہ کبریائی صرف خدا کی ذات کے لیے مخصوص ہے، بندے کا مقام عجز و نیاز کے سوا اور کچھ نہیں۔ کسی بندے میں اگر فی الواقع کوئی بھلائی پیدا ہو تو یہ اللہ کا فضل ہے، فخر کا نہیں شکر کا مقام ہے۔ اس پر اللہ کے حضور اور زیادہ عاجزی پیش کرنی چاہیے اور اس تھوڑی سی پونجی کو خیر کی خدمت میں لگا دینا چاہیے تاکہ اللہ اپنے مزید فضل سے نوازے اور یہ پونجی ترقی کرے۔ بھلائی پا کر غرورِ نفس میں مبتلا ہونا تو دراصل اسے برائی سے بدل لینا ہے اور یہ ترقی کا نہیں بلکہ تنزل کا راستہ ہے۔

احساسِ بندگی کے بعد دوسری چیز جو انسان کو تکبر کے رجحانات سے بچا سکتی ہے وہ محاسبۂ نفس ہے۔ جو شخص اپنا ٹھیک ٹھیک حساب لگائے اور اپنی خوبیوں کو محسوس کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھے کہ وہ کن کمزوریوں اور خامیوں اور کوتاہیوں میں مبتلا ہے، وہ کبھی خود پسندی و خود پرستی کے مرض کا شکار نہیں ہو سکتا۔ اپنے گناہوں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور قصوروں پر کسی کی نگاہ ہو تو استغفار سے اس کو اتنی فرصت ہی نہ ملے کہ استکبار کی ہوا اس کے سر میں سما سکے۔

اس غلط رجحان کو روکنے والی ایک اور چیز یہ ہے کہ آدمی صرف اُن پستیوں ہی کی طرف نہ دیکھے جن سے وہ اپنے آپ کو بلند پاتا ہے، بلکہ دین و اخلاق کی اُن بلندیوں کو بھی دیکھے جن کے مقابلے میں ابھی وہ بہت پست ہے۔ اخلاق و روحانیت کی پستیاں بھی لامتناہی ہیں اور بلندیاں بھی لامتناہی۔ بُرے سے بُرا آدمی بھی نیچے کی طرف دیکھے تو کسی کو اپنے سے بدتر پا کر اپنی برتری پر فخر کر سکتا ہے۔ مگر اس فخر کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ وہ اپنی موجودہ حالت پر مطمئن ہو کر بہتر بننے کی کوشش چھوڑ دیتا ہے، بلکہ اس سے گزر کر نفس کی شیطنت اسے یہ اطمینان بھی دلاتی ہے کہ کچھ اور زیادہ نیچے اتر جانے کی بھی ابھی گنجائش ہے۔ یہ نقطۂ نظر صرف وہی لوگ اختیار کر سکتے ہیں جو اپنی ترقی کے دشمن ہوں۔ ترقی کی سچی طلب رکھنے والے ہمیشہ نیچے دیکھنے کے بجائے اوپر دیکھتے ہیں، ہر بلندی پر پہونچ کر مزید بلندیاں ان کے سامنے آتی ہیں جنھیں دیکھ کر فخر کے بجائے اپنی پستی کا احساس ان کے دل میں خلش پیدا کرتا ہے اور یہی خلش انھیں اور زیادہ اوپر چڑھنے پر آمادہ کرتی ہے۔

ان سب چیزوں کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ جماعت ہر وقت اس معاملے میں چوکنّی رہے اور اپنے دائرے میں کبر و تعلّی اور فخر و غرور کے ہر ظہور کا نوٹس لے کر بروقت اس کا تدارک کرے۔ مگر تدارک کی یہ کوشش کبھی ایسے طریقوں سے نہ ہونی چاہیے کہ لوگوں میں بناوٹی انکسار اور نمائشی تواضع کی بیماری پیدا ہو جائے۔ کبر کی اُس سے بدتر کوئی قسم نہیں ہے جس پر تصنع کے ساتھ عجز و انکسار کا پردہ ڈالا گیا ہو۔

دوسرا بڑا عیب جو خیر کی جڑوں کو کھا جانے میں کبر سے کسی طرح کم نہیں، یہ ہے کہ کوئی شخص اور گروہ بھلائی کا کام نمود و نمائش کے لیے کرے اور اس کام میں اسے خلق کی تحسین حاصل کرنے کی فکر یا اس کی پروا ہو۔ یہ چیز صرف خلوص ہی کی نہیں، حقیقت میں ایمان کی بھی ضد ہے اور اسی بنا پر اسے چھپا ہوا شرک قرار دیا گیا ہے۔ خدا اور آخرت پر ایمان کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ انسان صرف خدا کی رضا کے لیے کام کرے، اسی سے اجر کی آس لگائے اور دنیا کے بجائے آخرت کے نتائج پر نگاہ رکھے۔ لیکن ریاکار انسان خلق کی رضا کو مقصود بناتا ہے خلق ہی کے اجر کا طالب ہوتا ہے، اور دنیا ہی میں اپنا اجر نام و نمود، شہرت، ہر دل عزیزی، نفوذ و اثر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور حشمت و جاہ کی شکل میں پا لینا چاہتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے خلق کو خدا کا شریک یا اس کا مدِّ مقابل بنایا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں آدمی خدا کے دین کی خواہ کتنی اور کیسی ہی خدمت کرے، بہرحال وہ نہ خدا کے لیے ہوگی، نہ اس کے دین کی خاطر ہوگی، اور نہ اس کا شمار خدا کے ہاں نیکیوں میں ہوگا۔

صرف یہی نہیں کہ یہ ناپاک جذبہ نتیجہ کے اعتبار سے عمل کو ضائع کر دیتا ہے، بلکہ درحقیقت اس کے ساتھ کوئی صحیح عمل کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔ اس جذبے کی فطری خاصیت یہ ہے کہ آدمی کو کام سے زیادہ کام کے اشتہار کی فکر ہوتی ہے۔ وہ اسی کو کام سمجھتا ہے جس کا ڈھنڈورا دنیا میں پٹے اور تحسین و آفرین کا خراج وصول کر کے لائے۔ خاموش کام جس کا خدا کے سوا کسی کو پتہ نہ ہو اس کے نزدیک کوئی کام نہیں ہوتا۔ اس طرح آدمی کے عمل کا دائرہ صرف قابلِ اشتہار اعمال تک محدود ہو جاتا ہے، اور اشتہار کا مقصود حاصل ہو جانے کے بعد خود ان اعمال کے ساتھ بھی اسے کوئی دلچسپی باقی نہیں رہتی۔ آغاز کار میں خواہ کتنے ہی خلوص کے ساتھ عملی زندگی کی ابتدا کی گئی ہو، یہ بیماری لگتے ہی خلوص اس طرح غائب ہونا شروع ہو جاتا ہے جیسے دق کی بیماری آدمی کی قوتِ حیات کو کھاتی چلی جاتی ہے۔ پھر اس کے لیے یہ ممکن نہیں رہتا کہ منظرِ عام سے ہٹ کر بھی نیک رہے، اور اپنا فرض سمجھ کر بھی کوئی فرض بجا لائے۔ وہ ہر چیز کو اس کی نمائشی قدر اور تحسینِ خلق کی قیمت کے لحاظ سے جانچتا ہے۔ ہر معاملے میں صرف یہ دیکھتا ہے کہ دنیا کس روش کو پسند کرتی ہے۔ اور کسی ایسے کام کا تصور کرنا بھی اس کے لیے ناممکن ہوتا ہے جو دنیا میں اسے غیر مقبول بنائے، خواہ ایمان داری کے ساتھ اس کے ضمیر کی آواز یہی ہو کہ وہ ہے کرنے کا کام۔

گوشوں میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرنے والوں کے لیے اس فتنے سے بچنا نسبتاً بہت آسان ہے، مگر جو لوگ پبلک میں آکر اصلاح اور خدمت اور تعمیر کے کام کریں وہ ہر وقت اس خطرے میں مبتلا رہتے ہیں کہ نہ معلوم کب اس اخلاقی دق کے جراثیم ان کے اندر نفوذ کر جائیں۔ انھیں بہرحال بہت سے وہ کام کرنے ہوتے ہیں جو منظرِ عام پر آتے ہیں۔ انھیں عوام الناس کو اپنا ہم نوا بنانے اور ان کے اندر اثر حاصل کرنے کی کوشش کرنی ہوتی ہے۔ ان کے کام کی بہت سی ضروریات اس بات پر بھی انھیں مجبور کرتی ہیں کہ اپنے کاموں کی روداد یں شائع کریں۔ ان کی کچھ نہ کچھ خدمات ایسی بھی ہوتی ہیں جو ان کی طرف خلق کا رجوع بڑھاتی اور زبانوں سے ان کے لیے تحسین کے کلمات نکلواتی ہیں۔ انہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مخالفتوں سے بھی سابقہ پیش آتا ہو اور اپنی مدافعت میں بادلِ ناخواستہ ہی سہی، انہیں مجبوراً اپنے اچھے پہلوؤں کو نمایاں کرنا پڑتا ہو۔ ان حالات میں یہ کوئی آسان کام نہیں ہے کہ شہرت ہو مگر شہرت کی چاٹ نہ لگنے، نمود اور نمائش ہو مگر نمود و نمائش کی خاطر کام کرنے کی بیماری نہ لگے، مقبولیت ہو مگر وہ مقصود نہ بننے پائے، تحسینِ خلق حاصل ہو مگر اس کے حصول کی فکر یا اس کی پروا نہ ہو، ریا کی پیدائش کے اسباب چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہوں مگر ریا سے دامن بچا رہے۔ اس کے لیے بڑی کاوش، بڑی توجہ اور بڑی محنت کی ضرورت ہے۔ ایک ذرا سا تساہل بھی اس معاملے میں ریاکاری کے جراثیم کو گھس آنے کا راستہ دے سکتا ہے۔

اس سے بچنے کے لیے انفرادی کوشش بھی ہونی چاہیے اور اجتماعی کوشش بھی۔ انفرادی کوشش کا طریقہ یہ ہے کہ ہر شخص کچھ نہ کچھ ایسے نیک اعمال کا التزام کرے جو زیادہ سے زیادہ اخفا کے ساتھ ہوں، اور ہمیشہ اپنے نفس کا جائزہ لے کر دیکھتا رہے کہ اسے زیادہ دلچسپی ان مخفی نیکیوں میں محسوس ہوتی ہے یا اُن نیکیوں میں جو منظرِ عام پر آنے والی ہوں۔ اگر دوسری صورت ہو تو آدمی کو فوراً خبردار ہو جانا چاہیے کہ ریا اس کے اندر نفوذ کر رہا ہے اور اللہ سے پناہ مانگتے ہوئے پوری قوتِ ارادی کے ساتھ نفس کی اس کیفیت کو بدلنے کی سعی کرنی چاہیے۔

اجتماعی کوشش کی صورت یہ ہے کہ جماعت اپنے دائرے میں ریاکارانہ رجحانات کو کبھی نہ پنپنے دے، اپنے کاموں میں اعلان و اظہار کو بس حقیقی ضرورت تک محدود رکھے، شوقِ نمائش کا ادنیٰ سا اثر بھی جہاں محسوس ہو اس کا فوراً سدِّباب کرے۔ جماعتی مشوروں اور گفتگوؤں میں یہ بات کبھی اشارۃً و کنایۃً بھی برداشت نہ کی جائے کہ فلاں کام اس لیے کرنا چاہیے کہ وہ مقبولیت کا ذریعہ ہے اور فلاں کام اس لیے نہ کرنا چاہیے کہ اسے لوگ پسند نہیں کرتے۔ جماعت کا داخلی ماحول ایسا ہونا چاہیے کہ وہ لوگوں کی تعریف اور مذمت، ہر دو سے بے نیاز ہو کر کام کرنے کی ذہنیت پیدا کرے اور اُس ذہنیت کی پرورش نہ کرے جو مذمت سے دل شکستہ ہو اور تعریف سے غذا پائے۔ اس کے باوجود اگر کچھ افراد جماعت میں ایسے پائے جائیں جن میں ریا کی بُو محسوس ہو تو ان کی ہمت افزائی کرنے کے بجائے ان کے علاج کی فکر کی جانی چاہیے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تیسرا بنیادی عیب نیت کا کھوٹ ہے جس پر کسی خیر کی عمارت قائم نہیں ہوسکتی۔ خیر کا کام صرف اس خالص نیت ہی سے ہوسکتا ہے کہ دنیا میں بھلائی پھیلے اور ہم اس کے لیے سعی کر کے اللہ کے ہاں سرخ رُو ہوں۔ اس نیت کے ساتھ اپنی کوئی ذاتی یا گروہی غرض شامل نہ ہونی چاہیے، اپنا کوئی دنیوی مفاد پیشِ نظر نہ ہونا چاہیے حتیٰ کہ کسی تاویل کے ساتھ بھی اس مقصدِ خیر کے ساتھ اپنے لیے کسی منفعت کی طلب یا امید کی لاگ لگی نہ رہنی چاہیے۔ ایسا ہر کھوٹ نہ صرف یہ کہ اللہ کے ہاں آدمی کے اجر کو ضائع کر دے گا بلکہ دنیا میں بھی اس آلودگی کو لیے ہوئے کوئی صحیح کام نہ ہو سکے گا۔ نیت کی خرابی لامحالہ کردار پر اثر انداز ہوگی، اور کردار کی خرابی کے ساتھ اُس جدوجہد میں کامیاب ہونا ممکن نہیں ہے جس کا اصل مقصود برائی کو مٹا کر بھلائی کو قائم کرنا ہے۔

یہاں پھر وہی مشکل پیش آتی ہے جس کی طرف ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں۔ جزوی بھلائیوں کے لیے کام کرنے کی صورت میں نیت کو اس کھوٹ سے پاک رکھنا کچھ زیادہ دشوار نہیں ہے۔ تھوڑا سا تعلق باللہ اور جذبہ صادق بھی اس کے لیے کافی ہوسکتا ہے۔ مگر جن لوگوں کے پیشِ نظر یہ ہو کہ ایک پورے ملک کے نظامِ زندگی کی اصلاح کی جائے اور اسے بحیثیتِ مجموعی اُن بنیادوں پر استوار کیا جائے جو اسلام نے ہمیں دی ہیں، وہ اپنے مقصد کے حصول کے لیے صرف تعمیرِ افکار، یا صرف تبلیغ و تلقین، یا صرف اصلاحِ اخلاق کی کوششوں پر اکتفا نہیں کر سکتے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ انہیں لامحالہ ملک کے سیاسی نظام کا رُخ بھی اپنے مقصد کی طرف موڑنے کے لیے بالواسطہ یا بلاواسطہ جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ اور سیاسی نظام کی تبدیلی لازماً اس بات کو متضمن ہے کہ جو لوگ اس تبدیلی کے لیے کوشاں ہوں، اقتدار یا تو براہِ راست ان کے ہاتھ میں آئے، یا کسی ایسے گروہ کی طرف منتقل ہو جسے ان کی تائید اور پشت پناہی حاصل ہو۔ دونوں صورتوں میں سے خواہ کوئی صورت بھی ہو، اقتدار کا تصور سیاسی نظام کی تبدیلی سے منفک نہیں ہوسکتا۔ اب یہ قعرِ دریا میں رہ کر دامن تر نہ ہونے دینے کا معاملہ ہے کہ ایک جماعت یہ کام کرے اور پورے انہماک کے ساتھ کرے اور پھر بھی اس کے افراد کی انفرادی نیتوں اور پوری جماعت کی مجموعی نیت کو "اپنے لیے اقتدار کی طلب" کا کھوٹ نہ لگنے پائے۔ یہ چیز بڑا مجاہدہ نفس اور بڑا تزکیۂ قلب و روح چاہتی ہے۔

(باقی صفحہ ۲۱۶ پر)

© rasailojaraid.com